مولانا امین احسن اصلاحی

دعوۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

دعوتِ دین

کی اہمیت اور تقاضے

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

کتاب	:	دعوت دین کی اہمیت اور تقاضے
مصنف	:	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
ترتیب و تدوین	:	ڈاکٹر محمد شاہد رفیع
حروف خوانی	:	عامر حسن، وحید احمد
نگران طباعت	:	حیران خٹک
سرورق	:	محمد طارق اعظم
کمپوزنگ	:	محمد اعظم
اشاعت دوم	:	۲۰۱۰ء
تعداد	:	۲۰۰۰
طابع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی پریس اسلام آباد
قیمت	:	۳۲روپے

ISBN-978-969-556-094-5

ناشر

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی پوسٹ بکس ۱۴۸۵، اسلام آباد

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اللہ جل مجدہٗ اور پیغمبر اعظم و آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک پاکیزہ مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لیے اس کے جملہ خد و خال کو بیان فرمایا۔ اُن خوبیوں کو بیان فرمایا جو کسی بھی کامیاب معاشرے کا حسن ہوتی ہیں اور اُن مفاسد اور گمراہیوں کو بھی کھول کھول کر بیان فرمایا جو معاشرتی حسن کو دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہیں اور پورا معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید فرقان حمید نے اوامر و نواہی کے ساتھ ساتھ جو ماضی کی اقوام و ملل کے قصص بیان فرمائے ہیں اُن کا مقصد محض واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ قرآن اُمتِ مسلمہ کو عروج و زوال کے یہ قصے اس لیے سناتا ہے کہ یہ وہ اقدارِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ ہیں جنہیں اپنا کر مختلف اقوام کی تقدیر کا ستارۂ کمال بلندی پر چمکا اور یہ وہ مفاسد اور خرافات ہیں جنہوں نے اقوام کو قعرِ مذلت میں گرا دیا۔ اور یہ سنت الٰہیہ ہے کہ انہی بنیادوں پر اللہ جل مجدہٗ نوازتا ہے اور غضب ناک بھی ہوتا ہے۔

قرآن کے مخاطبین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیواؤں میں سے ایک معتد بہ طبقہ آج اغیار کی تقلید میں جہاں اپنی اقدار اور شناخت سے محروم ہو چکا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ اُن ابدی محاسن سے بھی تہی دست ہو چکا ہے جو کبھی مسلم معاشرے کا طرۂ امتیاز تھے۔

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد اقدارِ اسلامیہ کو پروان چڑھانے اور اخلاقی برائیوں کے تدارک کے لیے جہاں ٹریننگ پروگرام کا اہتمام کرتی ہے وہاں مختلف طبقات کے لیے آسان، عام پیرایۂ بیان میں قرآن و سنت کی روشنی میں ضخیم کتب کے ساتھ ساتھ کتابچہ جات کی طباعت کا بھی اہتمام کرتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اللہ جل شانہٗ دعوۃ اکیڈمی کے کارکنان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور اپنے فضلِ خاص سے سرفراز فرمائے، آمین۔

پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

ڈائریکٹر

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تبلیغ کس لیے؟

انبیاء کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کردی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ خلقت اور ایک بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرکے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کا مستحق ہو اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلاف فطرت روش پر سزا پائے۔ لیکن اگر ایک طرف اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے تو دوسری طرف بعض اعتبارات سے اس میں خلا اور نقص بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کو ہدایت و ضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا اور نہ آخرت میں اس کو جزا وسزا دینے کے لیے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا بلکہ فطرت کے مقتضیات اور اس کی مخفی قابلیتوں کو آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لیے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کرسکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید کی ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے۔

رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ م بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا O (النساء۴: ۱۶۵)

اور ہم نے بھیجے اپنے رسول خوشخبری دیتے ہوئے اور ہوشیار کرتے ہوئے تاکہ لوگوں کے پاس ان رسولوں کے بعد اللہ کے خلاف کوئی عذر نہ باقی رہ جائے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَ نَا مِنْ م بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ز فَقَدْ جَآءَ كُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O (المائدة ۵: ۱۹)

اے اہل کتاب، انبیاء کے ایک وقفہ کے بعد، ہمارا رسول تمہارے پاس دین حق کو واضح کرتا ہوا آ گیا ہے تاکہ تم (قیامت کے دن) یہ عذر نہ کرسکو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا (دیکھو) ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

انبیاء کے باب میں قانونِ الٰہی

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے اور محض اس لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہو جائے، کج روی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ انبیاء کے بارے میں قانونِ الٰہی یہ رہا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثنیٰ انسانوں میں سے آئے، فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں آئے تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے تقاضے انسانوں ہی کے ذریعہ سے واضح کیے جائیں۔ لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونہ کا کام

دے سکتا ہے؟ اسی طرح بعض مستثنیٰ مثالوں کے سوا ، ہر قوم کے اندر، اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے لیے قبول حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قوم کے لوگوں پر، اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہوسکے اور زبان صاف ستھری اور سب کے فہم سے قریب تر اور دلنشین استعمال کی۔ پھر اللہ کے ان رسولوں نے صرف یہی نہیں کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی طرف پکار دیا ہو بلکہ اپنی پوری کی پوری زندگیاں اسی مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی ان کو خود بھی کر کے دکھادیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کیا۔ یہ سب اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بدعملیوں کا الزام اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر نہ ڈال سکیں۔

خاتم الانبیاء کی بعثت

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کرلیے جو ساری دنیا کو ایک داعی حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاق و اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کرسکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائل، اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کرلی کہ ایک ہادی کا پیغامِ ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بہ سہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس

بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو بھیجے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو وہ مکمل نظام زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظام زندگی ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاء لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے۔ پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی۔ خاتم الانبیاء ﷺ نے عقائد کی تعلیم اس معیارِ فہم کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان کی قوموں کے خاص مزاج اور ان کے خاص خاص امراض کی بھی رعایت تھی۔ لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج و رجحان کے لحاظ کے بجائے صرف مزاج انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظام زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان کی قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا اور آنحضرتؐ کے ذریعہ سے جو نظام زندگی دنیا کو ملا وہ صرف کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ بنی نوع انسان کی تمام انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے دو پہلو

آنحضرت ﷺ پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت و رہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمامِ حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایک بعثتِ خاص دوسری بعثتِ عام۔ آپؐ کی بعثت خاص اہل عرب کی طرف تھی اور اہل عرب کے ساتھ اسی خاص نسبت کی وجہ سے آپؐ کو نبی امی یا نبی عربی کہا

گیا اور آپؐ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی زبان بھی عربی ہوئی۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں (یعنی تبلیغ اور اتمام حجت) آنحضرت ﷺ نے براہِ راست انجام دیں۔

آپؐ کی بعثتِ عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت عطا فرمائی اوراس امت کو یہ حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جس دین حق کی تبلیغ تم پر کی ہے اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرۃ۲: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تاکہ تم لوگوں پر (اللہ کے دین کی) گواہی دو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ م بَلَغَ (الانعام۶: ۱۹)

اور میرے پاس اس قرآن کی وحی آئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تم کو ہوشیار کروں اور جن کو یہ پہنچے (وہ دوسروں کو ہوشیار کریں)

دین کی حفاظت کے لیے دو خاص انتظام

آنحضرت ﷺ کی بعثتِ عام کے مقصد کی تکمیل کے لیے پوری امت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا تاکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوت حق قیامت تک بلند ہوتی رہے اور دنیا الگ الگ نبیوں کی بعثت اور الگ الگ زبانوں میں وحی کے اترنے کی ضرورت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جائے۔ چونکہ آپؐ کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی، خلق کی رہنمائی اور اتمام حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لیے آپؐ کی امت پر ڈال

دی گئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے۔

ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیل سے محفوظ فرما دیا تاکہ دنیا کو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔

دوسرا یہ کہ اس امت کے اندر جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے، ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کردیا تاکہ جو لوگ حق کے طالب ہوں ان کے لیے ان کا علم و عمل شمع راہ کا کام دیتا رہے۔

اس طرح کی ایک جماعت (اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو) اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا کتنا ہی زور ہو لیکن یہ صالح جماعت آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے علم و عمل کو زندہ رکھے گی۔ جب ضلالت کا اثر اس امت کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ و ریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ جب دنیا کا خمیر اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بن جائے گا اور اہل بدعت کا اتنا زور ہوگا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت دنیا میں اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائے گی، اس وقت بھی یہ لوگ خلق کو معروف کی طرف پکارتے رہیں گے اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ جس طرح علم وحی کو قرآن کی صورت میں قیامت تک کے لیے محفوظ کردیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کے علم و عمل کو اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ

کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور خلق کی ہدایت اور رسول کی حجت تمام کرنے کے لیے جو روشنی مطلوب ہے وہ کبھی گل ہونے نہ پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑی کے چراغ ہوں گے۔ جن سے راہ ڈھونڈنے والے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جاسکے گی۔

تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی الناس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دینداری کے کام کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے مطلوب ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت عام کا جو مقصد اس امت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے، یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت ﷺ کی امت میں داخل ہے۔ یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر ڈالا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کریں گے تو وہ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے جس کا بار اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ڈالا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیر امت کے اس منصب سے محروم کردے جس پر اس فرض کی ادائیگی کے لیے ان کو سرفراز فرمایا ہے اور ساری دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے کیونکہ آج خلق پر اتمامِ حجت کا ذریعہ یہی ہیں۔ اگر یہ اتمامِ حجت کے فرض کو ادا نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر کر سکتی ہے کہ تو نے جن کو شہداء علی الناس بنایا تھا اور جن پر ہماری رہنمائی کی ذمہ داریاں ڈالی تھی انہوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ

پڑتے اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

تبلیغ کی شرائط

شہادت علی النّاس یا تبلیغ امت کی یہ ذمہ داری صرف اس بات سے ادا نہیں ہوسکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے خواہ وہ شہادت علی النّاس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے اور نہ ان الٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہوسکتی ہے جن سے نہ صرف یہ کہ دعوت حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ الٹا ان سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیائے کرام علیہ السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس فرض کی ادائیگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

پہلی شرط

اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دینِ حق کے شاہد ہیں، پہلے صدق دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے، اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (البقرة ۲ : ۲۸۵)

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کے رب کی جانب سے
اس پر اتاری گئی اور اہل ایمان ۔

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں خواہ وہ

آباء و اجداد کا دین ہو، خواہ قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو، خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو، سب سے دست بردار ہونے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا اور ان سارے خطرات میں، جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے۔

"انا اَوَّلُ المؤمِنِیْن" اور "انا اَوَّلُ المُسلمِیْن"

(میں پہلا مومن ہوں، میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے انہوں نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں ہوا کہ خود تو اس کے کنارے پر کھڑے رہے لیکن دوسروں کو للکارا کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اس میں چھلانگ لگادینے میں ہے۔

دوسری شرط

دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے، اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کرسکنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ "گونگا شیطان" ہے اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ

(آل عمران۳: ۱۸۷)

اور یاد کر جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم کتاب الٰہی کو پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کروگے اوراس کو چھپاؤ گے نہیں۔

اس معاملہ میں مصلحت بینی جو کچھ بھی ہونی چاہیے وہ دراصل حق کی خاطر ہونی چاہیے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر، صحیح محل میں، صحیح مخاطب کے سامنے ہو تاکہ دعوت حق کا تخم بار آور ہو۔ اگر آدمی حق کو بالکل نظر انداز کرکے مجرد اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ایک امر حق کے اظہار سے جی چراتا ہے یا اس

سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لیے کوئی واقعی خطرہ ہوا اور وہ اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچالے جائے، اس طرح کے کسی واقعی خطرہ کے بغیر اگر کوئی شخص اظہار حق سے جی چراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیت۔

تیسری شرط

تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت صرف قول ہی سے نہ دی جائے بلکہ عمل سے بھی دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی ﷺ کی خدمت میں آتے اور آپ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ یہ شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا، فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں اور اس کے ثبوت میں ان کے ان اعمال و اقوال کو ان کے سامنے رکھ دیا جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی۔ جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کا عمل اس کے موافق ہو ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقش قدم کا پیرو ہے جن کو قرآن نے ملامت کی ہے کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویہ اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ درحقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویہ اس کے دعویٰ کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لیے کسی اور حجت کی

ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں۔ اس کی دعوت بھی دیں اوراپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں‌اس پر عمل بھی کریں ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل ہی لغو حرکت ہے۔ ایسے بے عمل واعظوں کے وعظوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو یہ بات اس کے عدل کے خلاف ہوگی۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجت پوری طرح تمام ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔ عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں قابل درگزر ہیں ان کو قرآن نے خود بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتادیا ہے۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات و شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اٹھ جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کردیا جائے ۔ اس کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح کی جدوجہد کے بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنالے اور جس حالت اضطرار میں گرفتار ہو گیا ہے اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو شہادت علی الناس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا، باطل پر اس طرح قناعت نے اسے خود بخود اس منصب سے ہٹادیا۔

چوتھی شرط

چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیت سے

بالاتر ہو کر دی جائے، نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کرسکے جس کے ہم داعی ہیں اورنہ کسی قوم کی حمایت و حمیت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس طرح بے لاگ ہونا چاہیے اس کی تعلیم قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے۔

يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدة ۵: ۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے حق کی شہادت دینے والے بنو اور کسی قوم کی مخالفت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ۔

اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہیے اس کی تعلیم اس طرح دی ہے۔

يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (النساء۴: ۱۳۵)

اے ایمان والو! حق کے برپا کرنے والے بنو اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے اگرچہ یہ تمہارے اور تمہارے والدین اور اقربا کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔

پانچویں شرط

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو خدا کی طرف سے اترا ہے۔ کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں ہے، ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے، روزہ ہر شخص رکھے، زکوٰۃ ہر صاحب مال دے، حج ہر صاحب استطاعت کرے، نیکی،

دیانتداری، راست بازی اور پاکبازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے البتہ جن چیزوں کی شہادت کے لیے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کے لیے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور جب وہ وجود میں آجائے تواس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت و معیشت کا اجتماعی نظام اورملک کا سیاسی نظم ونسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈالنے کے لیے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہرگوشہ میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہوجائے گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے۔ ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کس طرح نبی ﷺ کو پورے دین کی ، بغیر کسی کمی بیشی کے دعوت کی تاکید کی گئی ہے۔

يٰٓأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ ۵: ۶۷)

اے رسول! جو (حق) تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس پورے حق کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرض رسالت کو ادا نہیں کیا (اور مخالفوں کی پروا نہ کرو) اللہ لوگوں کے شر سے تمہاری حفاظت کرے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (احزاب ۳۳: ۳۹)

جو اللہ کے حکموں کو پہنچاتے ہیں اوراسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے۔

وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ

(احزاب ۳۳: ۴۸)

اور کافروں اور منافقوں کی بات پر دھیان نہ کر۔ ان کی ایذا رسانیوں سے درگزر کر اور اللہ پر بھروسہ کر۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

پس اسی راہ کی دعوت دے اور اسی پر جمارہ جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی بدعتوں کی پیروی نہ کر اور کہہ دے کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔

چھٹی شرط

چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت ہو اللہ کے دین کی شہادت جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو، جنہوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لیے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی، ان کو شہید کہا گیا ہے اور غور کیجیے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا۔ لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی، درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی

حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے۔ پس جو ہمت ور یہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کا فرضِ منصبی

یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امت کو ''خیر امت'' کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرضِ منصبی کو بھلادیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں، نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے، نہ کوئی خاص وجہ فضیلت اورنہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ، بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں جو خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں، اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہوگئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے ''خیر امت'' ہونے کا ذکر ہے، اسی میں ان کی ذمہ داری بھی واضح کردی گئی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو، نیکی کا حکم دیتے ہوئے برائی سے روکتے ہوئے اوراللہ پر ایمان لاتے ہوئے۔

اس جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ(آل عمران ۳: ۱۰۴)

اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ایک گروہ جو لوگوں کو بھلائی کی

طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی
لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت ﷺ کے بعد اس امت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس اُمت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا، ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرض کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عنداللہ بری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہوگیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان ومال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر عاید ہو جاتی ہے اور جب تک وہ از سرنو اپنے نظام سیاسی کو درست نہ کر لیں، ان میں سے ہر ایک شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے، اسی طرح نظامِ خلافت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضہ شہادت علی الناس اس امت کے تمام افراد پر منتقل ہوگیا ہے اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کردیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اس وقت تک اس فریضہ کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے اور اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی۔ اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے۔

داعی حق کی ذمہ داری

داعی حق ہو یا داعی ضلالت دونوں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت اور ترغیب سے زیادہ کسی چیز کا اختیار نہیں بخشا ہے۔ نہ پیغمبروں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کے دل میں ہدایت ڈال دیں اور نہ شیطان ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو گمراہی کی راہ پر لگا دے۔ ان میں سے ہر ایک کو بس یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ اپنی اپنی راہ کی طرف خلق خدا کو بلا سکتے ہیں۔ ہدایت یا ضلالت کو اختیار کرنا، اختیار کرنے والے کی اپنی پسند اور اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق و تیسیر پر منحصر ہے اس توفیق اور تیسیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ بنادیا ہے جس کے مطابق وہ اپنے سلیم الفطرت اور ہدایت پسند بندوں کو نبیوں کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور کج روی اور گمراہی کو پسند کرنے والوں کے لیے شیطان کے راستوں پر چلنا آسان کر دیتا ہے۔

یہی حقیقت نبی اکرمؐ پر ان آیات میں واضح کی گئی ہے۔

اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ(القصص ۲۸ : ۵۶)

تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

وَمَآ اَکْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ O (یوسف ۱۲ : ۱۰۳)

اور اکثر لوگ، خواہ تم کتنا ہی چاہو، ایمان نہیں لانے کے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ O (النحل ۱۶ : ۳۷)

اگر تم ان کی راہ یابی کے متمنی ہو تو سن رکھو کہ اللہ نہیں راہ یاب کرتا ان لوگوں کو جن کو گمراہ کردیا ہے اور ایسوں کا کوئی مددگار نہیں!

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ O

(ابرھیم ۱۴ : ۱)

یہ کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں میں سے روشنی کی طرف لاؤ ان کے رب کی توفیق سے!

اس طرح ابلیس کو خطاب کرکے فرماتا ہے:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ

(الحجر ۱۵ : ۴۲)

میرے بندوں پر تجھ کو کوئی قابو حاصل نہیں۔ صرف ان پر تیرا زور چلے گا جو شریروں میں سے تیری پیروی کریں گے۔

خود ابلیس کی زبان سے اس کا یہ اعتراف نقل کیا ہے:

وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ج فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (ابراھیم ۱۴ : ۲۲)

اور مجھ کو تم پر کوئی اختیار نہیں ملا تھا۔ مگر یہ کہ میں نے تم کو دعوت دی تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا تو اب مجھ کو ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

اس امر واقعی کی وجہ سے جہاں تک ایک داعی حق کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر بالکل غور نہیں کرتا اور نہ اسے غور کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی دعوت پر کان دھریں گے یا نہیں اور نہ اس فکر میں وہ سر کھپاتا اور نہ اس کو سر کھپانا چاہیے

کہ زمانہ اس کی دعوت کے لیے سازگار ہے یا ناسازگار۔ وہ لوگوں کے ردّ و قبول، اپنی کوششوں کی کامیابی اور ناکامی اور دعوتِ حق کے انجام کے متعلق ایک بار یہ فیصلہ کرکے کہ اس امر کا تعلق اس کی ذات سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، بالکل مطمئن ہوجاتا ہے۔ وہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ خود اس کا اپنا فرض کیا ہے اور جب یہ طے کر لیتا ہے کہ اس کا اپنا فرض یہی ہے کہ وہ اس مقصد کی دعوت دے جس کو وہ حق سمجھ رہا ہے اور جو اس کے خیال میں تمام دنیا کے لیے یکساں مفید ہے، تو یہ طے کرچکنے کے بعد وہ اس تردّد میں نہیں پڑتا کہ لوگ اس کو دعوت کو قبول کرنے کے بارے میں اپنا فرض پورا کریں گے یا نہیں اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو دنیا میں برپا کرے گا یا نہیں؟

جہاں تک لوگوں کے ردّ و قبول کا تعلق ہے وہ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں اس کی اپنی ذمہ داری بدستور قائم رہتی ہے۔ اگر وہ قبول کریں گے تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کی راہیں کھلیں گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ادائے فرض و دعوت کا اجر و ثواب حاصل کرے گا اور اگر نہ قبول کریں گے تو اس کے ذریعہ سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری ہوگی اور داعی اللہ کے ہاں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش قرار دیا جائے گا کہ اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کر دیا۔ قرآن میں داعیان حق کی ایک جماعت کا جواب نقل ہوا ہے جن کو ان لوگوں کے سامنے بے فائدہ اپنی دعوت پیش کرنے سے روکا گیا تھا جو دعوت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔ اس جواب سے داعی حق کے فرض کی نوعیت واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت قبول کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اس کا فرض صرف حق کی دعوت دیتے رہنا ہے۔ اگر لوگ قبول کریں گے تو ہدایت پائیں گے اور اگر نہ قبول کریں گے تو یہ اللہ کے ہاں بری الذمہ قرار پائے گا۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ن اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْمُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ط قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ O (الاعراف۷: ۱۶۴)

اور جب کہ کہا ان میں سے ایک جماعت نے کہ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو یا تواللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا ہے یا کم از کم سخت عذاب دینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا عذر واضح ہوجائے اور تا کہ وہ خدا سے ڈریں۔

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا معاملہ تو مجرد یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس حق کو واضح کیا ہے، اس کے دل کے اندر یہ اطمینان پیدا کرتی ہے کہ اس حق کی دعوت دینا، لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا اور دنیا میں اس کا فروغ پانا ممکن ہے۔ اور اگر وہ اس کی طرف لوگوں کو بلانے اور دنیا میں اس کو برپا کرنا کا عزم لے کر اٹھے گا تو اللہ ضرور اس کام میں اس کی امداد فرمائے گا۔ ایک رحیم و کریم خدا کے متعلق وہ یہ بدگمانی نہیں کرسکتا کہ جس راستہ کی طرف وہ رہبری کرے کہ یہ صراط مستقیم ہے اس راستہ پر چلانا ناممکن ہو اور جس نظام زندگی کی بابت وہ فرمائے کہ یہ فطری نظام زندگی ہے وہ اتنا پیچیدہ اور ناممکن العمل ہو کہ لوگ اس کو اختیار ہی نہ کرسکیں۔ نیز ایک عادل اور مہربان پروردگار کے متعلق وہ یہ بدگمانی بھی نہیں کرسکتا کہ وہ اس پر ایک فرض عائد کر کے یہ حکم دے کہ تیرے کرنے کا کام یہ ہے اور اسی کے کرنے میں تیری نجات اور میری خوشنودی ہے لیکن جب وہ اس کو کرنا شروع کرے اوراس کے سامنے مشکلیں آئیں تو وہ اس کو تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی کوئی مدد نہ فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ حسنِ ظن اور یہ اعتماد ہر داعی حق کے اندر موجود

ہوتا ہے اور مخالفین جب اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کرتے ہیں۔ اور بظاہر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کام اب آگے نہیں بڑھنے کا ہے تو یہی اعتماد اس کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ جس راستہ کی طرف خود خدا نے اشارہ فرمایا ہے کہ راہِ حق یہ ہے تو اس پر چلنے والا منزل مقصود تک ضرور پہنچ کر رہے گا اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں لیکن بالآخر اللہ کی مدد ضرور آکر رہے گی۔ داعیانِ حق کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی تعلق اور اعتماد ہے جو سورۃ ابراہیم کی اس آیت سے ظاہر ہورہا ہے۔

> وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ۭ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (ابراهیم ۱۴ : ۱۲)
>
> اور کیوں نہ ہم اعتماد کریں اللہ پر جب کہ اس نے خود ہم پر ہماری راہیں کھولی ہیں اور ہم صبر کریں گے ان تکلیفوں پر جو تم ہمیں پہنچاؤ گے۔ اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی اپنی ذمہ داری کی حدود متعین کرنے میں غلطی کرجاتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس پر صرف اسی حد تک ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ حق کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دے بلکہ وہ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ لوگ اس حق کو قبول بھی کرلیں۔ اس غلطی کا لازمی نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر حق خالص کو پیش کرنے کے بجائے مخالفین کے باطل عقائد و افکار کے ساتھ سمجھوتا کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے ،اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل غلط ذمہ داری اپنے سر اٹھا لینے کی وجہ سے اپنی زندگی سخت افکار اور الجھنوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس طرح کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قرآن نے مفصل ہدایات دی ہیں مثلاً:

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ O (الانعام٦: ٦٩)

ان لوگوں سے جو خدا سے ڈرتے ہیں، ان لوگوں کے اعمال کی پرسش نہ ہو گی جو خدا سے نہیں ڈرتے بلکہ (ان لوگوں کی ذمہ داری) صرف یاددہانی کردینا ہے تاکہ وہ ڈریں۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَO وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ط وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ج وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ O (الانعام٦: ١٠٦-١٠٧)

تو پیروی کر اس چیز کی جو تیرے اوپر خدا کی طرف سے اتاری جا رہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور مشرکوں سے اعراض کرو اگر اللہ چاہتا کہ یہ مشرکین شرک نہ کرنے پائیں تو یہ شرک نہ کر سکتے (لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملے میں زبردستی نہیں کی ہے) اور ہم نے تم کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ یہ کوئی غلطی نہ کرنے پائیں) اور نہ تم ان پر وکیل بنا کر بھیجے گئے ہو (کہ ان کے ایمان کے معاملہ کی ذمہ داری تم پر ہو)

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُO (الرعد ١٣: ٤٠)

تمہارے اوپر صرف پوری طرح پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

طٰهٰ O مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓىO اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰىO (طٰهٰ ٢٠: ١-٣)

ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم اپنی زندگی مصیبت میں ڈال لو۔ یہ تو یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو

اللہ سے ڈرتے ہیں۔

اس زمانہ میں جو لوگ طاغوت کے عالمگیر تسلّط کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور دعوتِ حق کا کوئی امکان نہیں پا رہے ہیں یا دعوتِ حق کے پھیلنے کا امکان نہ پاکر دعوتِ باطل ہی میں لگ گئے ہیں۔ یہ لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے اگر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ ان کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے۔ لوگوں کا ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اوراس دعوت کا فروغ پانا یا نہ پانا ان سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے تو نہ وہ امکان اور عدم امکان کی اُلجھنوں میں پڑتے اور نہ وہ ایک باطل کو برپا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے بلکہ اپنے مقدور بھر حق کی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے کہ جب وہ خود حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے تو اس حق کو ضرور برپا کرے گا جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لینی چاہی اور جب انہیں اندازہ ہوا کہ یہ بوجھ بھاری ہے، ان سے نہیں اٹھ سکے گا تو مجبوراً ان کو یہ اعلان بھی کرنا پڑا کہ ہرچند خیر و برکت والا نظام تو وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے لیکن اس زمانے میں اس کا وسیع پیمانہ پر قیام چونکہ ناممکن ہے اس وجہ سے اس کے سوا چارا نہیں کہ ایک غیر اسلامی نظام ہی کی دعوت دی جائے اور اسی کو قبول کرلیا جائے۔

اس خیال کے اندر گمراہیاں چھپی ہوئی ہیں ان سب کو نہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے ظاہر کرنے کی یہاں گنجائش ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف ہم اشارہ کرنے چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے دیدہ دانستہ حق کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ محض اس خیال سے اختیار کی کہ اس راہ پر چل کر وہ بزعم خود آسانی سے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں حالانکہ اس راہ میں بھی کامیابی

(جس کو وہ کامیابی سمجھتے ہیں) اگر حاصل ہو گی تو اللہ کے حکم ہی سے حاصل ہو گی نہ کہ خود ان کی سعی و تدبیر سے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ ایک باطل راہ پر چل کر اس بات کا انتظام کرتے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ میں ان کی رسی دراز کرے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ خود بھی راہ حق پر چلتے، اور اسی پر چلنے کی دوسروں کو بھی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق اور کامیابی کے منتظر رہتے؟

یہ خطرناک غلطی جس نے ان کی ساری جدوجہد کو ایک بالکل غلط راہ پر لگا دیا صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ بحیثیت داعی انہوں نے اپنی ذمہ داری کی حدود کو ٹھیک ٹھیک متعین نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا فرض صرف اسی قدر نہیں سمجھا کہ جس حق کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی ہے اس حق کو بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچادیں بلکہ اپنا فرض یہ بھی سمجھا کہ لوگوں کو اس کا معتقد بھی بنا دیں اور جب یہ کام انہیں بہت مشکل نظر آیا تو انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل ہی کو اختیار کر لیا کہ لوگ آسانی سے اس کے معتقد بن سکیں گے۔ یہ غلطی لازمی طور پر ایک داعی کو رحمان کے راستہ سے ہٹا کر شیطان کے راستہ پر ڈال دیتی ہے اور وہ صرف داعی ہی نہیں رہ جاتا بلکہ مدعی بن کر خدا کے حقوق میں دراندازی کرنے والا اور ایک نیا دین پیش کرنے والا بن جاتا ہے۔

ایک داعی اگر اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہنچانتا ہے تو اس سے اس بات کا اندیشہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مایوس اور بددل ہو کر بیٹھ رہے یا حق کی جگہ باطل ہی کی دعوت شروع کردے، البتہ اس کو اس پہلو سے اپنی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں اس خیال کی وجہ سے کہ اس کے اوپر صرف ابلاغ ہی کی ذمہ داری ہے، اس کے اندر بے پروائی اور سہل انگاری نہ پیدا ہو جائے۔ اپنے آپ کو اس چیز سے بچانے کے لیے اس کو ہمیشہ ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو داعی پر بحیثیت داعی عائد ہوتی ہیں اور جن کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں ڈر

ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے مواخذہ ہو جائے کہ اس نے تبلیغ یا ادائے شہادت کافرض اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح اس کوادا کرنے کا حق تھا۔ حضرات انبیاءؑ کا جہاں تک تعلق ہے ان کو فرضِ رسالت کی ذمہ داریوں کا اس درجہ شدید احساس ہوتا تھا کہ بسا اوقات نہ اپنے ضروری آرام کا خیال کرتے نہ اپنی اور اپنی دعوت کی عزت و شان کا بلکہ ان کے غیر معمولی انہماک سے ایسا ظاہر ہوا کہ گویا وہ اپنے آپ کو لوگوں کے کفرو ایمان کا ذمہ دار سمجھے رہے ہیں۔ اس انہماک پر اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ کو محبت آمیز انداز میں ٹوکا ہے جس کی بعض مثالیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہی انہماک ، افراط و تفریط سے بچ کر، ہر داعیٔ حق کی خصوصیت ہونا چاہیے۔

انبیائے کرام کا طریق تربیت

کوئی دعوت حق دنیا میں مفید اور نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ساتھ ایک تدریجی اور مستقل پروگرام تربیت کا نہ ہو۔ اس چیز کے لیے یوں تو ہر دعوت و تحریک کی فطرت تقاضا کرتی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک دعوتِ حق کا تو یہ ایسا لازمی جزو ہے کہ اس کے بغیر اس کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ یہ زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ کو متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کے تمام ظاہر و باطن کو ایک نیا جلوہ دیتی ہے، اور صرف کسی جزوی تبدیلی ہی کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھتی، بلکہ ہماری ساری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک بالکل نیا سانچہ اور نئی اسکیم پیش کرتے ہیں اس وجہ سے یہ اس کے عین مزاج ہی کا تقاضا ہے کہ جس تدریج و ترتیب کے ساتھ خود آگے بڑھتی ہے، اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے بالکل متوازی ایک تربیت کا پروگرام بھی ہوتا ہے جو اہمیت میں کسی طرح بھی اصل دعوت سے کم نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت کی اہمیت اصل دعوت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہو کیونکہ یہ تربیت ہی ہے جس کی وجہ سے کوئی دعوت دلوں میں جڑ پکڑتی ہے، پھر نشوونما پاتی ہے، پھر برگ و بار لاتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن اپنے فوائد و برکات سے معاشرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔ ایک داعی حق کے کام کی صحیح مثال ایک دہقان کے کام سے دی جاسکتی ہے۔ جس طرح اس کا مقصد صرف اتنی سی بات سے حاصل نہیں ہوسکتا کہ کچھ بیج کسی زمین میں ڈال کر فارغ ہو بیٹھے اسی طرح

ایک داعی حق کا کام بھی صرف اتنے سے انجام نہیں پا سکتا کہ وہ لوگوں کو کچھ وعظ سنا کر سو رہے۔ بلکہ اس کے مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر اپنی پھیلائی ہوئی دعوت کے ساتھ وہی لگاؤ ہو جو ایک فرض شناس کسان کو اپنے بوئے ہوئے بیج کے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح کسان نگرانی کرتا ہے کہ بیج زمین میں جڑ پکڑے، اس کو صحیح وقت پر پانی ملے، موسم کی ناسازگاریوں سے محفوظ رہے، صحیح طور پر نشوونما پائے ، بیگانہ سبزے اس کی ترقی میں مزاحم نہ ہوں، فضا کے پرندوں اور زمین کے چرندوں کی تاخت سے وہ سلامت رہے اور جب ایک مدت تک اس دھن میں اپنے دن کے اطمینان اور رات کے سکون کو وہ درہم برہم رکھتا ہے، لگا تار محنت اور مسلسل نگہداشت کرتا ہے، تب جاکر کہیں اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اسی صورت میں اپنی دعوت کو پھولتے پھلتے دیکھنا نصیب ہوتا ہے جب وہ دعوت کے ساتھ ساتھ تربیت کی جانکاہیوں کے ایک طویل سلسلہ کو جھیلنے کی قابلیت اور ہمت رکھتا ہو۔ ورنہ جس طرح ایک غافل کسان کے بوئے ہوئے بیج زمین اور موسم کی بے مہریوں اور چرندو پرند کی ترکتازیوں کی نذر ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک داعی کی دعوت بھی صدا بصحرا ہوکے رہ جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت و تربیت پر غور کرنے سے تربیت کے لیے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم چیزوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

اجتماعی تربیت کی پہلی اصل

کسی بھی دعوتی تنظیم کے لیے تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ داعی کو تعلیم و دعوت کے کام میں جلد بازی سے احتراز کرنا

چاہیے۔ اس کو یہ برابر دیکھتے رہنا چاہیے کہ تعلیم کی جو خوراک اس نے دی ہے وہ اچھی طرح ہضم ہو کر لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بن گئی ہے یا نہیں؟ اس کا پورا پورا اندازہ کیے بغیر اگر مزید غذا دے دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فساد معدہ اور سوء ہضم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جن لوگوں نے داعیان حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر داعی حق سے معاملہ دعوت میں جلد بازی کے لیے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے۔ جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں وہ حق کی لذت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نئی آشنائی ان میں حق کا ایسا شوق پیدا کردیتی ہے کہ تدریج وترتیب کا پروگرام ان پر بہت شاق گزرتا ہے وہ حق کی حرص میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوت ہضم کا صحیح اندازہ کر پاتے ہیں، نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کا لحاظ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصلی حیثیت سے زیادہ تولتے ہیں اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی ان کی استعداد سے زیادہ قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر ''هَلْ مِنْ مَّزِيْد '' کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ جو ابھی دعوت کے مخالف ہوتے ہیں وہ دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر اس کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں پاتے تو یہی مطالبہ شروع کردیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز ان کے مطالبہ کے جواب میں فوراً نہ پیش کی گئی۔ تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرسکیں گے کہ یہ محض ایک بے مقصد اور مجہول دعوت ہے، اس کے آگے نہ کوئی متعین منزل مقصود ہے نہ اس منزل تک پہنچنے کا کوئی واضح اور ٹھوس پروگرام ہے اور اگر کوئی چیز پیش کی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈ کر لوگوں کو دکھا سکیں گے اور اگر کوئی رخنہ تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا تو اس کو

پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

علاوہ ازیں ایک سچے داعی حق کے اندر تبلیغ حق کی ایک پرزور خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبر و انتظام اور تدریج و ترتیب کے سارے حدود و قیود ،وہ توڑ ڈالے۔ اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبہ جب مشتعل کردیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے۔ ہر چند حق کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے آدمی میں ندیدوں کی سی بھوک ہو جو اسے مضطرب بھی رکھے، بے صبر بھی بنادے اور جلد بازی پر بھی مجبور کر دے لیکن جماعت کی تربیت کا مطالبہ حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبہ سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم رکھے۔ اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لیے بے چین کردے تو چاہیے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظار پر مجبور کرے۔ اگر اعلانِ حق کا شوق اور حمایت حق کا جذبہ اس کو اکسائے کہ نہ وہ اہل شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے نہ معاندین پر اتمام حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے تو چاہیے کہ تربیت کے اہتمام کے لیے وہ اس امر پر بھی نظر رکھے کہ کہیں شراب قدح خوار کے ظرف سے زیادہ نہ ہو جائے۔

جب کبھی ایسا ہوا کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آگیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہوسکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی رخنہ سے شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دے دیے ہیں اور پھر اس کے پھیلائے ہوئے فتنوں کی لپیٹ میں پوری جماعت آ گئی۔ اس کی سب سے زیادہ عبرت انگیز مثال ہم کو بنی

اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جب مصر سے نکل کر سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو احکام شریعت سے آگاہ کرنے لیے طور پر بلایا اور اس غرض کے لیے ایک خاص دن معین فرما دیا۔ حضرت موسیٰؑ اس متعین دن سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ان کے اندر اللہ کے احکام معلوم کرنے اور اس کی رضا کا جو جوش و جذبہ تھا اولاً تو وہ خود ہی اتنا قوی تھا کہ باریابی کا اشارہ پانے کے بعد وقت اور تاریخ کی پابندیاں اس پر شاق تھیں۔ ثانیاً قوم کی طرف سے ہر قدم پر جو مطالبے پر مطالبے ہو رہے تھے اس سے بھی اس جذبہ کو تحریک ہوئی ہو گی۔ اگرچہ یہ جذبہ نہایت اعلیٰ اور محمود جذبہ تھا اور طور پر معین وقت سے پہلے پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اللہ کے احکام معلوم کرنے کے لیے نہایت بے چین اور مضطرب دل رکھتے ہیں لیکن اس معاملہ کا ایک دوسرا قابل اعتراض پہلو بھی تھا، جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کی نظر نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فوراً بلانے کے بجائے ان کے لیے جو ایک خاص وقت مقرر کیا تو اس سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ یہ وقفہ وہ قوم کی تربیت میں صرف کریں اور جن اُصولی باتوں کی قوم کو تعلیم دی جا چکی ہے اس کو اچھی طرح ان کے اندر پختہ کریں تاکہ آزمائشوں اور فتنوں میں پڑنے کے بعد بھی وہ ایمان و اسلام کو سلامت رکھ سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے مزید احکام معلوم کرنے کا شوق ان پر اس قدر غالب آ گیا کہ تربیت کی اہمیت کا احساس اس کے مقابل میں دب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے دشمنوں نے ان کی اس غیر حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصے کو گئو سالہ پرستی میں مبتلا کردیا اوراس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی عجلت پسندی پر ڈالی،جو ہر چند تعلیم و دعوت ہی کی راہ میں تھی۔ لیکن بہرحال تربیت کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے

والی ثابت ہوئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اوراس کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَآ اَعۡجَلَکَ عَنۡ قَوۡمِکَ یٰمُوۡسٰی۝ قَالَ ھُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیۡ وَعَجِلۡتُ اِلَیۡکَ رَبِّ لِتَرۡضٰی۝ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَکَ مِنۡ بَعۡدِکَ وَاَضَلَّھُمُ السَّامِرِیُّ ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۸۳-۸۵)

اور تم قوم کو چھوڑ کر، اے موسیٰ وقت مقررہ سے پہلے کیوں چلے آئے؟ انہوں نے کہا وہ میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس اے پروردگار، اس لیے جلد ہی چلا آیا کہ تیری خوشنودی حاصل کروں تو فرمایا جاؤ ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے چلے آنے کے بعد فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایک داعی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے۔اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرے تا کہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکروعمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے، جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتاہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبر و انتظار مطلوب ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا۔ دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکام الٰہی معلوم کرنے کے لیے تھی۔ آنحضرت ﷺ بھی اپنے فطری شوق علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحی الٰہی جلد جلد نازل ہوتا کہ آپ اپنے شوق علم کو بھی تسلی دے سکیں اور قوم کے مطالبہ کو بھی پورا کر سکیں۔ چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے جب وحی الٰہی اترتی، آپ ایک پرشوق طالب کی طرح اس کے سیکھنے میں جلد بازی فرماتے ۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات پر متعدد جگہ آپ کو ٹوکا کہ وحی الٰہی کی تکمیل کے لیے جو مدت مقرر رہے اس سے پہلے پورے قرآن کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ یہ وقفہ اور انتظام تمہارے دل کو مضبوط کرنے اور تمہاری قوم کی تربیت کے لیے ہے تاکہ جو کچھ تمہیں سکھایا جا رہا ہے اس کو تم بھی برداشت کر سکو اور تمہاری قوم بھی اس میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا ○ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِىَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ○

(طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴-۱۱۵)

اور قرآن کے لیے اس سے پہلے کہ اس کی وحی تم پر تمام کی جائے۔ جلدی نہ مچاؤ۔ (البتہ) یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار، میرے علم کو زیادہ کر اس سے پہلے ہم نے آدم پر ایک ذمہ داری ڈالی تھی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔

اس آیت کے آخر میں جلدبازی سے بچنے کے ساتھ ساتھ تربیت کی

اہمیت بھی واضح فرما دی ہے۔ کہ انسان میں یہ فطری کمزوری ہے کہ رغبت اور خواہشوں کے مقابل میں اس کا ارادہ کمزور پڑ جایا کرتا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس پر جو ذمہ داری ڈالی جائے اس کا پورا شعور پیدا کرنے کے لیے اس کی اچھی تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ آزمائشوں کے مقابل میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھ سکے۔

اسی تربیت کے تقاضے سے قرآن مجید تھوڑ تھوڑا کر کے اترتا تو جلد باز مخالفین اعتراض کرتے کہ اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو جستہ جستہ کیوں اتر رہی ہے؟ خدا کا علم تو حاضر و مستقبل سب کو گھیر ہوئے ہے، اس کو تو نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ تجربے کرنے کی اور نہ کسی مصلحت پر نظر رکھنے کی، پھر آخر وہ کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیتا؟ یہ تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، غور و فکر اور محنت و تجربہ کے بعد جتنی کچھ تیار کر پاتے ہیں اس کو پیش کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس اعتراض کا اثر بہت سے مسلمانوں پر بھی ہوا اور یہ بات خود حضور نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر بھی گراں گذری، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ تو مخالفین کی جلد بازی کی حوصلہ افزائی فرمائی اور نہ اس خلش ہی کو کچھ اہمیت دی جو نکتہ چینوں کے اس اعتراض اور فطری شوق علم کی وجہ سے آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ فرمایا کہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے احکام تھوڑے تھوڑے کر کے ایک تدریج کے ساتھ اتریں تاکہ تمہار اول بھی ان کو تحمل کے لیے پوری طرح مضبوط ہوجائے اور جماعت کے قوی اور ضعیف بھی ان کو ان کے اچھی طرح اپنا لیں۔ اگر جلد بازی کرو گے تو تمہاری امت میں کمزوری رہ جائے گی اور جس طرح سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہی

میں ڈال دیا تھا اسی طرح کوئی سامری تمہاری امت میں بھی پیدا ہو کر اس کو گمراہی میں مبتلا کردے گا۔

جو تدریج قرآن کے نزول میں ہم پاتے ہیں بعینہٖ وہی تدریج صحابہؓ اور بعد کے لوگوں نے اس کو سیکھنے اور سکھانے میں بھی ملحوظ رکھی۔ اس کی مصلحت بھی بعینہٖ وہی تھی کہ جو لوگ اس کو سیکھیں اس طرح سیکھیں کہ یہ ان کے ذہن ودماغ کے اندر بھی پیوست ہو جائے اوران کی عملی زندگی بھی بالکل اس کے رنگ میں رنگ جائے۔ یہ بات صرف اس صورت میں ممکن تھی کہ اس کی تعلیم ایک تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ لوگوں کو دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس علم کے مطابق ان کی تربیت بھی کی جائے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ :

قَالَ کَانَ الرَّجل مِنَّا اذَا تعلّم عشر اٰیات لَمْ یجاوزھن حتّٰی یعلم معانیھن والعمل بِھِنَّ

ہم میں جو شخص دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کے علم وعمل میں اچھی طرح پختہ نہ ہوجاتا آگے نہ بڑھتا۔

دوسری اصل

جماعتی تربیت کی دوسری اصل یہ ہے کہ داعی کمیت سے زیادہ کیفیت پر نظر رکھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی پر ''کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش'' کا شوق اس قدر غالب ہوجایا کرتا ہے کہ وہ گلہ کی بھیڑوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس غفلت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں میدانوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھررہا ہوتا ہے اور ادھر گلہ کی بھیڑیں یا تو بھوکوں مرنے لگ جاتی ہیں یا کوئی بھیڑ یا باڑے کے اندر گھس کر ان کو چیر پھاڑ

ڈالتا ہے۔ اپنوں سے یہ بے پروائی اور بیگانوں کو اپنانے کی یہ خواہش داعیانِ حق کے اندر نہایت نیک جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ان پر دعوت کا جوش اس قدر غالب ہوجاتا ہے کہ تربیت کے فرض کا احساس اس مقابل میں یا تو دب جاتا ہے یا کم از کم ثانوی ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کو زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں کہ جو اللہ کے باغی اور نافرمان ہیں وہ پہلے اللہ کا نام لینے والے بن جائیں، رہی ان کی تربیت و اصلاح تو یہ چیز بعد میں ہوتی رہے گی۔بظاہر تو یہ ایک نیک خیال ہے لیکن اگر اس کی تہہ میں غور کیا جائے تو یہی اصل ہے کیفیت کے مقابل میں کمیت کو ترجیح دینے کی اور پھر آگے چل کر اسی سے یہ غلط نقطہ نظر پیدا ہوجاتا ہے کہ لوگ دلوں کی جگہ سروں کی تعداد گن کر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس غلطی سے بچانے کے لیے داعیانِ حق کو یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ دعوت سے بیگانہ ہیں ان کو پکارنے اور اپنانے کی خواہش اتنی غالب نہ ہونی چاہیے کہ اس انہماک میں ان غریبوں کا حق مارا جائے جو بیچارے دعوت قبول کرکے تربیت و تزکیہ کے لیے منتظر بھی ہیں اور اس کے محتاج بھی ہیں۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (الحجر ۱۵: ۸۸)

ان (کفار کی) بعض جماعتوں کو ہم نے جو مال و متاع کی فراوانی دے رکھی ہے اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ اور نہ ان کے انکار پر غم کھاؤ، بلکہ مومنین کو اپنے سایہ عاطفت میں لو۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الکہف ۱۸: ۲۸)

اور تم اپنے دل کو ان لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کی رضا طلبی میں سرگرم دعا ہیں، ان سے غافل ہو کر

تمہاری نگاہیں دنیاوی زندگی کی زینتوں کی طرف نہ اٹھیں۔

عَبَسَ وَتَوَلّیٰٓ O اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی O وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّیٰٓ O اَوْیَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی O اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی O فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی O

(عبس ۸۰: ۱-۶)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ، پھیرا اس سبب سے کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے یا نصیحت پکڑے اور نصیحت اس کو فائدہ پہنچائے۔ باقی جو منہ پھیرتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو۔

ان تمام آیات میں داعی کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ دعوت قبول کرچکے ہیں اگرچہ وہ بظاہر تعداد کے لحاظ سے کم اور حیثیت کے لحاظ سے معمولی ہوں لیکن ان کی تربیت میں جو وقت صرف ہونا چاہیے وہ ان لوگوں کے پیچھے نہ برباد کیا جائے جو اگرچہ شان و عظمت رکھتے ہیں اور ان کی شان و عظمت سے دعوت کو فائدہ پہنچنے کی بھی توقع ہوسکتی ہے لیکن وہ گھمنڈ کے نشہ میں سرشار اور دعوت سے بیزار ہیں۔

تیسری اصل

جماعتی تربیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جماعت جن اصولوں پر بنی ہے جماعت کے کسی گوشہ میں ان سے انحراف یا بغاوت کی بیماری نہ پھیلنے دی جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی فتنہ سر اٹھاتا نظر آئے تو جماعت کے رہنماؤں اور ارباب کار کا فرض ہے کہ اس کے پھیلنے سے پہلے اس کے قلع قمع کی فکر کریں۔ اوراس فرض کی ادائیگی میں نہ مصلحت بینی مانع ہو نہ رواداری، نہ کسی کا خوف اور نہ کسی کی محبت۔ اس امر میں معمولی غفلت کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ظاہر ہوا کہ قوم کا ایک بڑا حصہ خدا پرستی کی جگہ گئو سالہ

پرستی میں مبتلا ہوگیا۔ اس قسم کے فتنوں کی سرکوبی کے لیے جماعت کے لیڈروں کو نہ صرف قوی دل ہونا چاہیے بلکہ کچھ مضائقہ نہیں اگر وہ سخت دل بھی ہوں تاکہ بالکل بے مروت ہوکر ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کے اندر جب شرک کے فتنہ کے پھوٹ پڑنے کی اطلاع ہوئی تو طور سے واپس آکر انہوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کو نہایت سختی سے ڈانٹا جو ان کی غیر موجودگی میں قوم کی نگرانی کے ذمہ دار تھے اور جن کی مروت یا رواداری کی وجہ سے اس خرابی کو پھیلنے کا موقع ملا پھر انہوں نے اصلی مجرموں کو خود ان کے قبیلہ کے لوگوں کے ہاتھوں قتل کروا دیا تاکہ ہر شخص پر یہ اچھی طرح واضح ہوجائے کہ جو لوگ جماعت کے اندر اس قسم کے فتنے پھیلائیں گے وہ ان لوگوں کی طرف سے بھی کسی رحم و کرم یا رواداری کی امید نہیں کرسکتے جن کے ساتھ وہ خون اور نسب کے قریبی رشتے رکھتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس بچھڑے کو بھی ریزہ ریزہ کرکے ناپیدا کردیا جو سامری نے بنایا تھا تاکہ اس فتنہ کا کوئی ادنیٰ نشان بھی قوم میں باقی نہ رہے اور خود سامری کو تو ایسی عبرت انگیز سزا دی جو اس کے ساتھ زندگی بھر کے لیے چمٹ گئی۔

اس قسم کی خرابیوں سے پاک رکھنے کے لیے اسلام نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ جب جماعت کے بعض افراد میں جماعتی اصولوں سے کوئی انحراف پایا جائے تو پوری جماعت کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام اور اصلاح کے لیے کوشش کرے اگر جماعت ایسا نہ کرے، بلکہ افراد کو چھوڑ دے کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں تو ان کے جرم کا وبال صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ جماعت کے فاسق اور متقی سب اس میں حصہ پاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس چیز کی حقیقت کشتی کی مثال دے کر سمجھائی ہے کہ اگر ایک کشتی کے مسافر اس شخص کا ہاتھ نہ پکڑیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہے تو اس کا

لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کشتی ڈوبے گی اور ایک شخص کی شرارت کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔ اسی طرح اگر ایک جماعت اپنے اندر کے شریروں سے رواداری برتتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ شریر جو آفت ڈھائیں اس میں بلا استثناء پوری جماعت مبتلا ہو۔ قرآن مجید نے اس خطرہ سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○ (الانفال ۸: ۲۵)

اور اس آفت سے بچو جو خاص کر انہی لوگوں پر نہیں آئے گی جنہوں نے تمہارے اندر سے ظلم کیا ہو گا (بلکہ دوسرے بھی اس کی لپیٹ میں آئیں گے) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت پاداش والا ہے۔

اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جماعت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے طریق کار مختلف ہو گا لیکن نفس فرض سے جماعت کسی حال میں بھی بری الذمہ نہیں ہوتی ابتدائی مرحلہ میں جب جماعت کو کوئی سیاسی طاقت حاصل نہیں ہوتی، صرف جماعت کا مزاج ان لوگوں کو اپنے اندر سے چھانٹ کر الگ کرتا رہتا ہے جو اس کے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں وہ اولاً تو ان لوگوں کو اپنے اندر جگہ ہی نہیں دیتی جو اس کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے نہ ہوں اور اگر اس قسم کے خام لوگ اس کے اندر کسی طرح گھس بھی آتے ہیں تو جس طرح ایک سلیم المزاج آدمی کے معدہ کے اندر مکھی قرار نہیں پکڑتی اور اسی طرح اس قسم کے لوگ اس نظام کے اندر نہیں ٹکتے۔ اگر اس پہلے ہی مرحلہ میں کسی جماعت کا یہ حال ہو کہ اس کے اصولوں سے انحراف کرنے والے اس کے اندر آسانی سے پرورش پا سکتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جماعت کا کوئی مزاج ہی نہیں

بنا ہے اور وہ بہت جلد منتشر ہو کے رہے گی۔ دوسرے مرحلہ میں یعنی جب جماعت کو سیاسی طاقت حاصل ہو جاتی ہے جماعت کا سیاسی ادارہ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ اس کے اندر فاسد عناصر پیدا ہونے یا گھسنے نہ پائیں ۔ وہ اس کی روک تھام کے لیے عام تبلیغی و تعلیمی وسائل کے ساتھ اگر ضرورت سمجھتا ہے تو طاقت کو بھی استعمال کرتا ہے۔ یہ سیاسی ادارہ اگر پوری فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے تو پوری جماعت ذمہ داری سے بری رہتی ہے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ یہ بگڑ جائے تو پوری جماعت کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علَم لے کر اٹھے اور جب تک اس کی اصلاح نہ کرلے چین کی نیند نہ سوئے۔اس دعوت اصلاح کی حد قرآن مجید نے یہ معین کی ہے کہ داعیان اصلاح صرف صدائے اصلاح پر قانع ہوجائیں بلکہ مجرمین کے طرزعمل سے اظہار بیزاری کرکے ان کے جرائم سے اپنے آپ کو عملاً علیحدہ بھی کرلیں۔

چوتھی اصل

جماعتی تربیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ ابتدائے دعوت میں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو تعلیم و دعوت کے اصل مرکز سے وابستہ رہنے کی تاکید بھی کی جائے اور اس کا سامان بھی بہم پہنچایا جائے۔ جس دور میں جماعت کا مزاج ابھی بن رہا ہو اس دور میں مناسب ماحول اور اصل مرکز سے براہِ راست وابستگی صحیح تربیت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ اس دور میں اگر ان دونوں چیزوں سے غفلت کی جائے تو جماعت کے اندر ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو عقلی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں سے اتنے مضبوط ہوں کہ اپنے آپ کو بھی دعوت کے اصلی رنگ میں رنگ لیں اور دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگ سکیں

بلکہ اس کے برعکس بیشتر ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جن پر دعوت کا رنگ ایسا ہلکا ہوتا ہے کہ آزمائش کی ایک ہی بھٹی سے گزرنے کے بعد اڑ جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ نہ فہم کے اعتبار سے اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ دوسروں کے اندر دعوت کا صحیح شعور پیدا کرسکیں نہ سیرت کے لحاظ سے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ ہر طرح کے موافق وناموافق حالات کے اندراس دعوت کو جاری رکھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک کوئی مؤثر شخصیت موجود ہوتی ہے، لوگوں کے اندر اس دعوت کا چرچا موجود رہتا ہے لیکن جوں ہی وہ سامنے سے ہٹی، سارا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ اسلام میں ہجرت کا جوحکم دیا گیا اس کے اندر جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی تھی کہ تمام مسلمان براہِ راست حضور نبی کریم ﷺ کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھا سکیں اور ایک سازگار ماحول میں رہ کر اسلام کا رنگ ان پر اچھی طرح چھا جائے۔ جہاں یہ بات ممکن نہ ہو کہ ہر شخص اصل مرکز تعلیم و دعوت سے براہِ راست فائدہ اٹھا سکے وہاں دعوت اسلامی کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے ذہین اور صالح اشخاص کی ٹولیاں مرکز کی تعلیم و دعوت سے استفادہ کے لیے نکلیں اور دین کا فہم حاصل کرنے کے بعد جب اپنی قوم میں لوٹیں تو ان کو دین سے باخبر کریں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۝

(التوبہ۹: ۱۲۲)

اور سارے مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تعلیم کے لیے نکلتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک ٹولی نکلتی تاکہ وہ دین کی بصیرت حاصل کرتی اور جب لوٹتی تو اپنی قوم کو آگاہ کرتی تاکہ وہ بھی خدا ترسی کی راہ اختیار کرتے۔

پانچویں اصل

جماعتی تربیت کا پانچواں اُصول یہ ہے کہ جماعت کے سامنے آزمائش کے جو مواقع آئیں ان میں جماعت کی غلطیوں اور خامیوں پر پوری نظر رکھی جائے اور جب وہ آزمائش کا وقت گزر جائے، اطمینان کا سانس لینے کا موقع میسر آجائے تو ان میں سے ہر غلطی اور خامی پر بے لاگ تنقید کی جائے اور یہ عقلی کمزوریاں جن اعتقادی خامیوں کی غمازی کررہی ہوں ان کو پوری وضاحت کے ساتھ کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے شروع میں اس تنقید کا خطاب عام ہونا چاہیے۔اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص اس تنقید سے متنبہ ہوگا اور اگر طبیعت میں صلاحیت ہوگی تو اس سے فائدہ بھی اٹھائے گا۔ پہلے ہی مرحلہ میں متعین طور پر صرف غلط کاروں کو نام بنام ملامت کرنے سے ان کو اپنی رسوائی کا احساس ہوتا ہے جس سے ان کے اندر اصلاح حال کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔ البتہ جب کسی گروہ کے متعلق بار بار کے تجربہ کے بعد بھی یہی ثابت ہوکہ وہ جماعت کے اصولوں سے صرف ذہنی الجھن کی وجہ سے یا محض اتفاقی طور پر انحراف نہیں کررہا ہے بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ اس نے منافقت ہی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے تواس کو براہِ راست اس کی غلطیوں پر متنبہ کرنا چاہیے اور پردہ داری اور روا داری کا طریقہ بدل دینا چاہیے۔ اس گروہ کو یہ آخری تنبیہ ہوگی۔ اس کے بعد بھی اگر یہ گروہ اپنی اصلاح نہ کرے تو پھر جماعت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اپنے اندر سے بالکل کاٹ پھینکے آنحضرت ﷺ نے منافقین کے ساتھ یہ طریقہ اختیار فرمایا، اور یہی طریقہ جماعتی تربیت کے لیے عقل و فطرت کے مطابق ہے جو لوگ قرآن مجید پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں بدر کی لڑائی وہ پہلا آزمائشی

موقع ہے جب یہ حقیت سامنے آئی کہ اسلامی جماعت کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر کچھ جراثیم نفاق کے چھپائے ہوئے ہیں ۔جنگ کے حالات گزرنے کے بعد قرآن نے ان لوگوں کے طرز عمل پر نہایت سختی سے تنقید کی جس کی شہادت سورۃ انفال سے مل رہی ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو تعیّن کے ساتھ ان کو مخاطب کرکے انہیں رسوا کیا گیا اور نہ ان کو جماعت ہی سے الگ کیا گیا۔ اس کے بعد ہر آزمائش کے موقع پر یہ گروہ اپنی کمزوریاں ظاہر کرتا رہا لیکن عام تنقید و نصیحت کے سوا قرآن نے ان پر براہِ راست کوئی ضرب نہیں لگائی تقریباً معرکہ تبوک تک یہی صورت حال قائم رہی لیکن جب ان لوگوں پر اچھی طرح حجت تمام ہوگئی اور یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ان لوگوں کی شرارتیں کسی بے علمی یا اتفاقی مغلوب الحالی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے کررہے ہیں تو پھر یہ لوگ جماعت کے اندر سے کاٹ کر علیحدہ کردیے گئے۔

خلاصۂ بحث

الف: آنحضرت ﷺ پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی، اس کی طرف نبی کریم ﷺ نے رہنمائی فرماکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ اُمت ہر ملک ، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

ب: اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے، بلاتقسیم و

تفریق ، پورے دین کی کی جائے، بے خوف لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے۔ اگر ضرورت ہو تو جان دے کر کی جائے۔

ج: اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

د: اس ادارہ کے منتشر ہوجانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

ح: اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

و: اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرض رسالت کے ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے، بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرک درحقیقت اس فرض عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمح نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظام دعوت خیر پھر وجود میں آجائے، جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمام حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہرمسلمان کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ کرسکتا ہے کرے۔ اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیے۔اسی کے لیے کھانا اور پینا چاہیے۔ اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہیے۔ اس کے بغیر

مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ رکھیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصد وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو "امت وسط" یا "خیر امت" کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ تعالیٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔